© rasailojaraid.com

ہیگل مارکس اور اسلامی نظام

(بقیہ باب ششم)

سود کی ممانعت سود کو ممنوع قرار دے کر اسلام نے معاشی زندگی کے ایک بڑے مفسدہ کو جڑ سے مٹا دیا۔ سود کی وجہ سے زرپرست ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ غریبوں کا خون چوسیں اور اُن کی گاڑھی کمائی سے اپنی دولت میں مزید اضافہ کریں۔ سود کا عام رواج دولت کی نامساوی تقسیم کا بھی سبب ہے۔ جس سوسائٹی میں یہ رواج عام ہوگا اس پر ہمیشہ طبقہ داری کشمکش اور غربت وفلاکت کی لعنت مسلط رہے گی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نے ہر طرح کے سود کو ممنوع قرار دیا ہے خواہ وہ تجارتی اور کاروباری سود ہو یا اس کی نوعیت کچھ اور ہو۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے جیسا کہ آج کل بہت سے تجدد پسند کہا کرتے ہیں کہ تجارتی اور معاشی کاروبار کے سلسلہ میں جو سود دیا جاتا ہے اس کی نوعیت اس سود سے مختلف ہے جس کی ممانعت اسلام نے کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی احکام کی رو سے ہر قسم کا سود قطعاً ناجائز ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ معاشی کاروباری سود چیز ہی دوسری ہے وہ شاید اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ موجودہ ظالمانہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی سود ہے۔ اگر آج حکومتیں سود کو ممنوع قرار دیدیں تو یہ نظام اپنی موجودہ شکل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ سود میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ کاروبار میں لگاتا ہے اُسے کاروبار کے نفع و نقصان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ وہ سود کی معینہ رقم حاصل کرنے پر قانع ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ کاروبار سے منفعت تو حاصل کر لیتا ہے لیکن نقصان کی صورت میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا کہ سود کے بغیر سرمایہ کی فراہمی محال ہوگی اور بغیر سرمایہ کے بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو چلانا محال ہوگا حقیقتاً اس کے بالکل خلاف ہے۔ اگر سود کو مٹا کر اس کی جگہ منافع (Profits) کی بنیاد پر معاشی تنظیم استوار کی جائے تو اس کی وجہ سے موجودہ زمانہ کی بے شمار معاشی خرابیاں اصلاح پذیر ہو سکتی ہیں۔ سود اور منافع میں بڑا فرق یہ ہے کہ سود ایک معینہ رقم ہے لیکن منافع میں رقم کا تعین نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی جمع کی ہوئی رقم پر پانچ فی صدی سود حاصل کر سکتا ہے تو اسے بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ سال کے ختم پر اتنی رقم ملے گی۔ لیکن اگر کاروبار اصولِ منفعت پر چل رہا ہو اور اسے بتا دیا جائے کہ منافع کا اتنا فی صدی حصہ تمہیں ملے گا تب بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے ختم سال پر کیا ملے گا۔ کیونکہ پہلے تو وہ یہی نہیں جانتا ہے کہ تجارت کو نفع ہوگا یا نقصان۔ اور اگر نفع کا یقین بھی ہے تو بھی وہ اپنے حصہ کا تعین نہیں کر سکتا۔

سود کی وجہ سے روپیہ لگانے والوں (Investors) کو معاشی اور تجارتی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ہے۔ انھیں تو سال کے ختم پر سود کی وصولی سے مطلب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنکھ بند کر کے وہ اپنا روپیہ بنکوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن بنکوں کی پالیسی پر انھیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ نہ تو بنک کی کارروائیوں پر انھیں تنقید یا نکتہ چینی کا کوئی حق ہوتا ہے اور نہ اُن کا کوئی نمائندہ بینک کے معاملات میں اپنی کوئی آواز رکھتا ہے کم از کم ان لاتعداد روپیہ لگانے والوں کی حد تک یہ بالکل صحیح ہے جن کا تعلق سرمایہ داروں کے گروہ سے نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بینک کا پورا کاروبار بڑے سرمایہ داروں کے مفاد و اغراض کا تابع رہتا ہے۔ کیونکہ چھوٹے چھوٹے روپیہ لگانے والوں کی آواز وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ بینک جس طرح چاہتے ہیں ان کا روپیہ صرف کرتے ہیں۔ اس طرح بینکروں کے ہاتھ میں ایک ایسی قوت آ جاتی ہے جسے وہ اپنے ہم طبقہ سرمایہ داروں کے مفاد و اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پھر چونکہ بینکنگ کا پورا نظام ایک محدود جماعت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے بطورِ لازمی نتیجہ کے ساری تجارت و صنعت اور سارے مالی ذرائع (Financial resources) پر بھی یہی محدود جماعت قابض ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بینکنگ کا نظام تجارت و صنعت کی بنیاد ہے۔ کوئی تجارت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور صنعت بینکوں کے تعاون یا ان کی امداد کے بغیر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مالی نظام جس طبقہ کے ہاتھ میں ہوگا تجارت و صنعت پر بھی اسی کا قبضہ ہوگا۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر ایک انگریز مصنف نے بطور طنز لکھا ہے کہ بینک آف انگلینڈ کا صدر زار روس سے کئی گنا زیادہ اقتدار و اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔ یہ استعارہ نہیں ہے حقیقت ہے۔

اگر سود کی جگہ معاشی کاروبار کی بنیاد منافع پر رکھی جائے تو ہر شخص اپنا روپیہ لگانے میں بڑی احتیاط اور دیکھ بھال سے کام لے گا کیونکہ اس صورت میں وہ صرف نفع کا شریک نہ ہوگا بلکہ نقصان میں بھی اُسے شرکت کرنا پڑے گی۔ مجبور ہو کر روپیہ لگانے والے بینک کے انتظام میں موثر نمائندگی کا مطالبہ کریں گے اور بینک کے کاروبار اور اس کی پالیسی پر ہر وقت نظر رکھیں گے۔ ساہوکاروں کی طاقت اس طرح بہت کم ہو جائے گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روپیہ لگانے والے صرف ایسے ہی کاروبار اور صنعتوں میں اپنا روپیہ لگائیں گے جن کی ملک کو واقعی ضرورت ہو اور جن کی پیداوار کے لیے پہلے ہی سے بازار میں مانگ موجود ہو۔ ایسا نہ کرنے سے انھیں نقصان کا اندیشہ ہوگا۔ یہ نہ ہوگا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ سرمایہ ایسی پیداوار پر صرف کیا جائے جس کی مانگ بازار میں نہیں، پھر اس پیداوار کی نکاسی کے لیے مصنوعی طلب پیدا کی جائے (To create demand)۔ اب ہوتا یہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اپنے فاضل سرمایہ سے مزید منافع حاصل کرنے کے لیے ایسی نئی نئی اشیا بنانے میں صرف کرتا ہے جن کی مانگ نہیں ہوتی ہے۔ پھر اس خوف سے کہ مبادا اس پیداوار کی کھپت نہ ہو اشتہار بازی اور دیگر جائز و ناجائز طریقوں سے لوگوں میں نئی نئی خواہشات پیدا کی جاتی ہیں اور مصنوعی طور سے اُن کی ضروریات کو بڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ ان اشیاء کی خریداری پر مائل ہوں حالانکہ درا صل انھیں ان اشیاء کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اسی وجہ سے ان چیزوں کی مانگ بھی پہلے سے نہیں ہوتی۔ یہ چیز بھی براہ راست موجودہ بینک کاری (Banking) کے نظام کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اہلِ صنعت (Industrialists) کو بینکوں کی وجہ سے بآسانی سرمایہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بینکوں پر بھی سرمایہ داروں کا قبضہ ہے اور صنعت پر بھی۔ اس لیے معاشی زندگی کے ان دونوں ستونوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بھٹکتی رہتی ہے۔

لیکن اگر سود کے بجائے منافع پر صنعتی اور مالی نظام چلایا جائے تو یہ صورت حال باقی نہیں رہے گی۔ منافع پر کاروبار کی صورت میں روپیہ لگانے والے مجبور ہوں گے کہ وہ یا تو خود کسی طریقہ سے بینکوں کے حساب و کتاب پر نگرانی رکھیں یا حکومت سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ وہ بینکوں کے حسابات کی جانچ پڑتال اور تنقیح کے لیے عمال مقرر کرے۔ دوسری صورت زیادہ قرین قیاس ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ بینک کاری افراد کے ہاتھ سے نکل کر حکومت کے ہاتھ میں آجائے گی یا کم از کم بینکوں پر اس کی موثر نگرانی قائم ہو جائے گی۔ اس طرح بے قید سرمایہ داری کا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اگر بینک کاری کا نظام اس طرح سے بالکلیہ حکومت کے ہاتھ میں آجائے تو حکومت پوری صنعتی اور معاشی زندگی کو اپنی موثر نگرانی میں لے سکے گی۔ کیونکہ بینک کاری معاشی نظام کی شہ رگ ہے۔ لیکن یہ اُسی صورت میں مفید ہوگا جب خود حکومت پر عوام الناس کے حقیقی نمائندوں کا قبضہ ہو یعنی ان لوگوں کا جو دل و جان سے عوام کی فلاح و بہبود کے خواہاں ہوں۔ ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بینک کاری نظام تو حکومت کے ہاتھ میں ہو لیکن روپیہ لگانے والے بھی نگرانی اور مشاورت کی غرض سے مجالس انتظامی میں اپنے منتخب نمائندے بھیجیں تا کہ یہ نظام، حکومت اور افراد کے باہمی تعاون پر مبنی ہو۔

اکتناز مال کی ممانعت غیر متوازن اور بے قید سرمایہ داری کو مٹانے کی غرض سے اسلام نے اکتناز مال Accumulation of wealth کو قطعاً ممنوع قرار دیا چنانچہ کلام مجید نے صریح الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ	ان لوگوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو جو
وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ	سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس میں کا کوئی حصہ خدا
أَلِيمٍ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ	کی راہ میں صرف نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا جب ان کے
بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ	چہرے اور پیشانیاں اسی سونے چاندی سے داغی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چیز اشتراکی نظام اور اسلام کے مابین وجہ امتیاز ہے۔

اشتراکیت نے معاشی زندگی کو سُدھارنے کے لیے صرف خارج میں ضابطہ بندیاں کرنے پر انحصار کر لیا اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ ضابطہ محض جبر اور مادی طاقت کے بل پر قائم ہوتا ہے اور جو نظام محض زور و طاقت اور جبر پر قائم ہو اس کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ تمدن کے کسی ضابطہ کو بقا و دوام نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ جمہور کے اپنے دلوں میں بھی اُس مقصد کے حصول کی لگن نہ ہو جسے قانون و ضابطہ بزور و جبر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اشتراکی نظام انسان کی پوری معاشی زندگی کو ضابطہ و قانون کی بندش میں جکڑ کر رکھ دیتا ہے اور اس زندگی کے کسی گوشے میں بھی انسان کے ارادے اور مرضی کو آزاد نہیں چھوڑتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام کے تحت انسان کے اخلاقی احساسات حالتِ تعطل میں رہیں گے اور قدرت کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ کسی قوت کا جمود و تعطل اس کی موت ہے۔ جس دنیا میں ہمدردی، صلہ رحمی، عزیز و اقربا کی امداد، غربا کی دستگیری کے مواقع ناپید ہوں، جہاں کسی شخص کو انفرادی طور سے اور اپنی آزاد مرضی سے کسی پر رحم کھانے، کسی کے کام آنے، کسی کو اپنی کمائی میں شریک کرنے کا موقعہ نہ ہو جس جماعت کے افراد باہمی معاملت اور آپس کے تعلقات میں ایثار و قربانی کی روح سے خالی ہوں، اس میں اخلاقی احساسات کا نشو و نما غیر ممکن ہے۔ چونکہ اشتراکی نظام کا مقصد ایک ایسی سوسائٹی کی تعمیر ہے جس میں کوئی فرد دوسرے کی معاشی امداد کا محتاج نہ ہوگا اور نہ کوئی شخص دوسروں کی امداد کو اپنا اخلاقی فرض خیال کرے گا اس لیے اس نظام میں انسان کی بعض اعلیٰ خصوصیات اور شریف جذبات مثلاً غربا کی اعانت، حاجتمندوں کی حاجت روائی، اور بیماروں کی عیادت و خبر گیری، اور اسی نوع کے دیگر انسانی خصائل یکسر ناپید ہو جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظام میں اجتماعی ادارے اِن فرائض کو سرانجام دیں گے۔ لیکن اول تو اجتماعی امداد شخصی اعانت کا بدل نہیں ہو سکتی، دوسرے جب افراد میں انفرادی طور پر اس صنفِ اخلاق کا نشو و نما بند ہو جائے گا تو اجتماعی اداروں کو وہ آدمی مل کہاں سکیں گے جن کے دل دوسروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے رحم وشفقت اور ہمدردی وایثار کے جذبات سے لبریز ہوں ؟ شخصی اعانت اخلاقی احساس کی بیداری اور حرکت کا پیمانہ ہے ۔ اجتماعی امداد اور اخلاقی احساس کے مابین کوئی لازمی تعلق نہیں ہے ۔ کیونکہ قائم شدہ روایات، عام رائے کا دباؤ یا محض جذبۂ تقلید اس نوع کی امداد کا محرک ہو سکتا ہے ۔ بخلاف اس کے شخصی اعانت کا جذبہ صرف اخلاقی احساس سے تحریک پاتا ہے ۔

اس کے برعکس اسلام معاشی زندگی کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ و قانون کی طاقت کے حوالے کرکے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے ، اور اس کے تصورات کی اصلاح ، اس کی سیرت و ذہنیت کی تشکیل ، اور ایک مناسب اجتماعی ماحول کی تخلیق کے ذریعہ سے بالواسطہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی احساسات کا یہ آزاد عمل غلط سمت میں نہ جائے ۔ اس طرح اسلام نے دیگر تمام امور کی طرح معاشی امور میں بھی انسان کے آزاد اور با اختیار ارادہ کے لیے ایک ایسا میدان چھوڑ دیا ہے جہاں اس پر اخلاقی احساسات کے سوا قانون یا حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے تاکہ اس میدان میں اس کی اخلاقی آزمائش ہو سکے ۔ اگر اشتراکیت کی طرح اسلام نے بھی جملہ معاشی امور کو قانون اور حکومت کے قبضہ میں دیدیا ہوتا تو پھر اس اخلاقی آزمائش کا کوئی موقع باقی نہ رہتا ۔ جو شخص قانون کی رو سے اس بات پر مجبور ہو کہ اپنی کمائی ایک لاشخصی (Impersonal) ادارہ کے حوالہ کردے اور پھر اس میں سے صرف اتنا ہی حصہ واپس لے جتنا اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو اس پر اخلاقی اچھائی یا برائی کا حکم کس طرح لگایا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ اس عمل میں اس کا آزاد ارادہ نہیں بلکہ قانون کا خوف کام کر رہا ہے ۔ البتہ اگر حکومت اور قانون کے خوف سے بے پروا ہو کر اُس سے یہ عمل سرزد ہوتا تب اس کے اخلاقی نشوونما کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ۔

اسی لیے اسلام نے انفاق فی سبیل اللہ کی پُرزور تلقین کی اور بتایا کہ نیکی حاصل نہیں ہو سکتی اگر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت انسان میں راسخ نہ ہو جائے ۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گویا حکومت اور قانون کو درمیان میں لائے بغیر اسلام انسان کے اخلاقی احساس کو اتنا مضبوط دیکھنا چاہتا ہے کہ جہاں خارج سے اس پر کوئی دباؤ یا دنیا کی ملامت و سرزنش کا کوئی موقع نہ ہو وہاں بھی ایک انسان دوسرے کی اعانت و دستگیری کو اپنا فرض منصبی خیال کرے۔ مسلمانوں کی شناخت بتلاتے ہوئے قرآن حکیم فرماتا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اُس میں سے راہ خدا میں صرف کرتے ہیں)، وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (وہ لوگ جو اپنے مال کو ظاہر اور پوشیدہ طور سے خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں)۔ پورا قرآن دیکھ جائیے تو معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ اور نماز کے بعد اگر کسی عمل کی بہ تکرار تلقین کی گئی ہے تو وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ لیکن انفاق فی سبیل اللہ اخلاقی فضیلت رکھنے کے علاوہ معاشی اہمیت کا بھی سرمایہ دار ہے۔ جس جماعت میں انفاق کی روح کام کر رہی ہوگی اس میں غربت و افلاس اور درد و مصیبت کی صدائیں مشکل سے سنی جا سکیں گی جس سوسائٹی میں غریبوں کی دستگیری، محتاجوں کی اعانت، یتیموں کی خبر گیری اور اقربا کی ہمدردی کا جذبہ برسر کار ہوگا وہاں معاشی تنگدستی کی شکایت پیدا ہی نہ ہوگی، جہاں انفاق کی سرگرمیاں ہوں گی وہاں گردش زر Circulation of money میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں اس میں رکاوٹ نہ ہوگی وہاں معاشی خرابیوں کا ایک بڑا دروازہ آپ سے آپ بند رہے گا۔ کیونکہ دنیا کے اکثر و بیشتر معاشی مفسدات اسی راہ سے آتے ہیں۔ گردش زر جتنی مکمل ہوگی معاشی زندگی اتنی ہی پر سکون ہوگی۔

اس طرح معاشی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو اس کے لیے ممکن ہو سکتی تھیں اور اس میدان میں وہ اشتراکیت سے اس کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام معاشی مساوات (Economic equality) سے زیادہ معاشرتی مساوات (Social equality) کا حامی اور موید ہے۔ معاشی مساوات اسے صرف اس حد تک مطلوب ہے کہ اجتماعی دولت کسی خاص طبقہ میں محدود نہ ہونے پائے۔ بلکہ جماعت کے زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم ہو اور ہر شخص کو اتنی روزی ضرور میسر آ جائے کہ وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ابتدائی ضروریات پوری کر سکے۔ اشتراکیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی طرح اسلام یہ نہیں چاہتا ہے کہ جملہ افراد معاشی حیثیت سے یکساں حالت میں ہوں یا معاشی زندگی کی اونچ نیچ بالکل ہموار اور ہم سطح ہو جائے۔ وہ ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے اور معاشی نامساوات کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا ہے بشرطیکہ یہ نامساوات ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ البتہ جس چیز کو وہ یکسر مٹا دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ دولت یا تموّل کی بنا پر افراد کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق و امتیاز پیدا ہو یا دولت ہی عزت کا واحد معیار ہو جائے۔ اس معاملہ میں اس کی راہ بالکل الگ ہے چنانچہ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت دار وہی ہے جس کے دل میں سب سے زیادہ اس کا خوف ہو وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنے آیا ہے جس میں دولت، علم، ہنر، عہدہ، نسل یا خاندان کوئی بھی عزت کا معیار نہ ہو اور جہاں فرق و امتیاز کی صرف ایک وجہ تسلیم کی جائے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو خداترسی اور خداپرستی میں کیا درجہ حاصل ہے۔

معاشرتی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے نماز باجماعت کو ہر مسلمان پر لازم قرار دیا ہے۔ یہ ایک بڑا نفسیاتی حربہ ہے جس سے وہ اپنے پیرووں میں معاشرتی مساوات اور اخوت کی رُوح پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز باجماعت کے التزام سے معاشرتی امتیازات پر ایک کاری ضرب پڑتی ہے۔ مندروں میں یکے بعد دیگرے پوجا پاٹ کرنے یا کلیساؤں میں ہفتہ میں ایک روز کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھ کر عبادت کرنے سے اخوت و مساوات کا وہ احساس پیدا نہیں ہوتا جو مسجد میں روزانہ پانچ وقت ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر عبادت کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ کسی مقام کے تمام مسلمان بلا فرق و امتیاز روزانہ پانچوں وقت مسجد میں اس طرح جمع ہوں اور پھر بھی ان میں باہم وہ بُعد و فصل باقی رہے جو معاشی درجہ بندیوں کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اہلِ ثروت اور اونچے طبقے کے لوگ اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو مساجد میں جماعت کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا اپنے مکان کے کسی گوشہ میں۔ عیدین اور جمعہ کے موقع پر تو وہ البتہ مسجد میں نظر آتے ہیں مگر روزانہ پانچ وقتوں میں سے ایک وقت بھی ان کی صورت مسجد میں نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی ہے کہ اگر وہ مسجد میں پانچوں وقت کی نماز ادا کرنا شروع کریں تو پھر وہ اپنے امتیازات اور معاشرتی مرتبہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معاشرتی مساوات کا قیام معاشی مساوات کے حصول سے کہیں زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہے ۔ کیونکہ معاشی مساوات کے حصول کے بعد بھی طبقہ واریت Class-stratification پیدا ہو سکتی ہے ۔ اشتراکیت نے انسانی زندگی کے اس نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر دیا کہ طبقاتی امتیازات مختلف شکلوں میں ظہور کر سکتے ہیں ۔ طبقہ واریت تنہا دولت اور معاش کی راہوں سے نہیں آتی ہے ۔ دوسری راہوں سے بھی اس مہلک مرض کا پھیلنا ممکن ہے ۔ اس کا قوی احتمال ہے کہ انسان معاشی حیثیت سے تو ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوں لیکن نسل ، خاندان ، عہدے یا اور کسی اعزاز کی بنا پر ان میں امتیازات پیدا ہو جائیں ۔ اس صورت حال کی مثالیں ہمیں ہندوؤں کی معاشرت میں بکثرت ملتی ہیں جہاں برہمنیت کسی معاشی مفاد پر نہیں بلکہ مذہبی اقتدار پر مبنی ہے ۔ اسی طرح چھتریوں نے اپنی ایک علیحدہ معاشرت بنالی ہے ۔ ساہوکار اور تجار مالدار ہونے کے باوجود برہمنوں اور چھتریوں سے کمتر درجہ رکھتے ہیں ۔ اشتراکیت کے قیام کے بعد بھی ممکن ہے کہ طبقہ واریت کسی اور شکل میں نمودار ہو جائے ۔ کسان اور مزدور ، عالم اور عامی ، پرولتاریہ اور اشتراکی حکمرانوں کے مابین طبقاتی امتیازات اور معاشرتی درجہ بندیوں کے حدود فاصل قائم ہو جائیں ۔ اور معاشی حیثیت سے یکساں ہونے کے باوجود ان کے آداب معاشرت میں نمایاں فرق پیدا ہو جائے ۔ اسی صورت حال کو دفع کرنے کی غرض سے اسلام نے اجتماعی عبادات کا نظام تیار کیا ہے تاکہ مسلمانوں میں باہم کوئی ایسا فرق و امتیاز نہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اپنے مشترک نصب العین کے مطابق زندگی نہ بسر کر سکیں یا ان کے معاشرتی اختلافات سیاسی اور مذہبی اختلافات کے سانچے میں ڈھل جائیں ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطبوعات

سیرت سید احمد شہید | مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی۔ ضخامت تقریباً ۵۰۴ صفحات۔ قیمت دو روپے۔ پتہ:- محمد معین الدہر صاحب۔ نمبر ۳۷ گوئن روڈ، لکھنؤ۔

اس کے پہلے ایڈیشن پر ان صفحات میں اس سے قبل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ نہایت مسرت کی بات ہے کہ طبع دوم کی نوبت جلد ہی آگئی، اور اس سے زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ فاضل مولف نے اس دوسری اشاعت کو پہلے سے زیادہ مفصل، پُر از معلومات اور مفید مباحث پر مشتمل بنا دیا ہے۔ اب سے سوا سو برس پہلے اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے جو عظیم الشان تحریک حضرت سید احمد بریلوی اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ کی سرکردگی میں اٹھی تھی اور جس نے تمام ہندوستان، بلکہ آس پاس کے ممالک تک میں روح اسلامی کی ایک زبردست لہر پھیلادی تھی، اس کے متعلق پہلی مرتبہ اتنی تفصیلی معلومات اس قدر مستند ذرائع سے اردو زبان میں فراہم ہوئی ہیں۔ امید ہے کہ اس کا مطالعہ متعدد حیثیات سے مفید ثابت ہوگا، اور خصوصیت کے ساتھ وہ لوگ اس سے بہت فائدہ اٹھائیں گے جو اسی مقصد عزیز کے لیے پھر ایک مرتبہ سعی کرنا چاہتے ہیں۔

مگر مولف کے کام کی پوری پوری قدر کرنے کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی اس تحریک کے اساتذہ اور اس کے نظام اور طریق عمل، اور اس کی کامیابیوں اور ناکامی کے اسباب، اور اس کے قوی اور کمزور پہلوؤں کے متعلق بہت کچھ مزید معلومات کی تلاش و جستجو ضروری ہے۔ نیز اس ذخیرۂ معلومات کو پوری طرح مفید بنانے کے لیے اس امر کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے بالکل سائنٹفک طریقہ پر مرتب کیا جائے اور تاریخ کے ایک محقق طالب علم کی طرح واقعات پر بے لاگ تنقید کی جائے۔ اگر ہمیں اپنے اسلاف کے کاموں اور ان کے تجربات سے اپنے حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر کے لیے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے تو سوانح نگاری کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قدیم طرز میں کافی ترمیم کر کے عقیدتمندی کے عنصر کو کم اور تنقید و تحقیق کے عنصر کو بڑھانا پڑے گا۔

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک | مولانا عبید اللہ سندھی۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ قیمت عہ۔ قسم اول ع۔ کتاب خانہ پنجاب، لاہور۔

اس کتاب میں مولانا عبید اللہ صاحب نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے اتباع کی مساعی انقلاب و اصلاح کا ایک مجمل تاریخی نقشہ پیش کیا ہے جس میں شاہ صاحب کے ظہور سے لے کر جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کے قیام تک کی تاریخ بالکل ایک نئے رنگ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ مولانا کا اصل بیان مجمل ہے جس سے ان کا مدعا پوری طرح واضح نہیں ہوتا، مگر حاشیہ پر ان کے تلمیذ رشید مولانا نور الحق صاحب علوی کی تشریحات مفصل ہیں جن سے مولانا کے بیان کو سمجھنے میں کافی مدد مل جاتی ہے۔ جہاں تک مولانا سندھی کی ذات کا تعلق ہے، کوئی شخص خواہ ان سے کتنا ہی اختلاف رکھتا ہو، بہرحال ان کے علم و فضل اور ان کی وسعت نظر اور ذکاوت و جودت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ ان کے قلم سے نکلا ہے اور جو کچھ اُن سے استفادہ کر کے مولانا نور الحق صاحب نے لکھا ہے وہ بہت سے لطیف علمی نکات اور بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہے جن کی قدر نہ کرنا ظلم ہوگا۔ لیکن بحیثیت مجموعی جب ہم اس کتاب کو دیکھتے ہیں تو اس میں تاریخ کم اور تاریخ سازی زیادہ نظر آتی ہے۔ اگر عالم برزخ میں شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبد العزیز صاحب اور اس سلسلہ کے دوسرے بزرگوں کو جمع کر کے یہ کتاب ان کے سامنے پیش کی جائے تو بعید نہیں کہ اپنے کارناموں کے اس مرقع کو دیکھ کر وہ حضرات خود بھی دنگ رہ جائیں۔ "حزب ولی اللّٰہی" کا جو نظام اور پروگرام بیان کیا گیا ہے، اور معاصر تاریخ کے واقعات سے اس "حزب" کا تعلق جس طرح دکھایا گیا ہے اس کی بیشتر تفصیلات کے لیے غالباً قیاس کے سوا کوئی اور بنیاد نہیں ہے۔ رہے اس "حزب" کے اساسی نظریات، تو ان کی جو تعبیر مولانا نے اور ان کے فاضل شارح نے پیش کی ہے اس کے بعض اجزاء کو معنیً صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے مگر بیشتر اجزاء تعبیر و تفسیر کی حد سے متجاوز ہیں۔ ماضی کے واقعات کو جدید طرز پر مرتب کرنا، یا بزرگان سلف کے کام کو جدید اصطلاحات

© rasailojaraid.com